غزالہ نگار اورکزئی
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ناولٹ

اس دفعہ وہی مثل صادق آئی تھی کہ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔" علی خان نے بھی بڑے عیش کر لیے تھے۔ ڈاکٹری کی اعلا ڈگریوں سمیت خوش خوش کبھی پنڈی، کبھی لاہور اور کبھی پشاور پھرتے رہے تھے۔ پھر نہ جانے محکمہ صحت کو کیا سوجھی کہ ایسے لائق فائق، اعلا تعلیم یافتہ، ڈاکٹر (علی خان) کو ذاتی خیال کے مطابق آؤ دیکھا نہ تاؤ، پکڑ کے تلتو ٹرانسفر کردیا۔ اور علی ہزار چکر چلانے کے باوجود لکیر ہی پیٹتے رہ گئے۔ ٹرانسفر رک نہ سکی۔ حالانکہ ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ آغاجی کے پرانے شناساؤں میں سے تھے۔

"اوہو، تو شادی کرلونا؟" ان کا مسئلہ سنتے ہی میری زبان سے بے اختیار جملہ پھسل گیا۔

جس پر دھیمے سروں میں خواتین کی طرف سے گالیوں اور کوسنوں کی بوچھاڑ سی آئی۔ (ہمارے ہاں کنواری لڑکیوں کا ایسے معاملات میں بولنا برا سمجھا جاتا ہے)

"تم اپنے الٹے سیدھے مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔" علی خان نے بھی منہ بنا کر میری طرف دیکھا۔

"اب میرا اچھا خاصا، مشورہ الشائیوں ہو گیا تھا کہ ان کو اب تک وہ ماورائی مخلوق نہ ملی تھی۔ جسے یہ اپنا

کوئی تارا کوئی جگنو

فرزانہ نگار اورکزئی
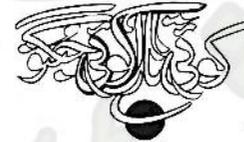
عالیشان اور حنی نے بھی موصوف کو صبر کرنے کی تلقین کی، تو مرتے کیا نہ کرتے۔ چارج لینے گلگت چلے ہی گئے۔ پتہ تھا کہ آغاجی استعفیٰ تو ہرگز نہیں دینے دیں گے۔ پوتے صاحب کو بس تلقین کریں گے کہ پوتے صاحب اسی لگن اور عزم سے دکھی انسانیت کی خدمت کرتے رہیں، جس کا اعلان انہوں نے ایف ایس سی اور ایم بی بی ایس میں ٹاپ کرنے کے بعد اپنے انٹرویوز میں کیا تھا۔

پر ایک ہفتے بعد ہی کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت منہ اٹھائے واپس چلے آرہے ہیں۔ پوچھ پچھ پر انکشاف ہوا کہ موصوف تنہائی برداشت نہیں کر پا رہے ہیں۔

آئیڈیل کہتے تھے۔ خود ہی سوچیے۔ ایشوریہ کیسی نزاکت، لتا سی آواز، مادھوری جیسی حاضر دماغی، رانی مکرجی جیسی مسکراہٹ اور نتالی ووڈ جیسا حسن کہاں جمع ہو کر ایک سانچے میں ڈھل سکتے ہیں بھلا جوان کی خانہ آبادی ہو جائے۔"

مجھ پر اپنی پانچوں بھوؤں کے ناجائز حملوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آغاجی نے میری برجستگی کو سراہا۔

"دلکشتہ ٹھیک کہتی ہے۔ آخر اس کے علاوہ کیا علاج ہو سکتا ہے۔ اس کی تنہائی کا؟ اتنی جلدی اس کا ٹرانسفر بھی نہیں ہوگا۔"

میں نے فخر سے گردن تانتے ہوئے خواتین کی

طرف دیکھا۔

"میں پوچھتی ہوں، آخر یہ لڑکا شادی کیوں نہیں کرتا؟ اس کے ساتھ کے لڑکے تو کئی بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔" امی ترخ کر بولیں۔

"اور کیا امی! جاوید اس سے پورے دس سال چھوٹا ہے اور اس کی بھی منگنی ہو چکی ہے خیر سے۔" میں پھر بولی۔

امی جی نے اتنی اونچی آواز میں دانت پیسنے شروع کیے کہ اس کی آواز میرے کانوں تک پہنچ جائے تاکہ مجھے اچھی طرح ان کے عتاب کا اندازہ ہو جائے۔ اور ظاہر ہے، میں نے اسے اپنی ماں کی سادگی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

"میں ابھی شادی کرنے کے لیے نہیں مر رہا ہوں! میں تو اس لیے آیا ہوں۔ کہ آغا بی بی (اپنی والدہ) اور تین چار لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔" علی خان جھلا کر بولے۔

"میں کیوں جاؤں تمہارے ساتھ؟ اس عمر میں پردیس نہیں جاؤں گی میں، اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر۔ انجان جگہ، نہ لوگ جان پہچان کے۔ نہ زبان۔ خواہ مخواہ اپنا گھر چھوڑوں۔ تم شادی کیوں نہیں کرتے؟ میں آخر کب تک تمہیں سنبھالوں گی؟" آغا بی بی بھی صاحبزادے کے ہاتھوں نالاں تھیں، چھوٹے بچوں کا تو خیر بہانا تھا کیونکہ شمیرا ابھی چوبیس سال کی تھی۔

"یاالٰہی۔ اس قوم کی ماؤں کو تو اولاد کی آزادی ذرا پسند نہیں۔ بس کھونٹے سے باندھ دینے کی فکر میں ہوتی ہیں۔" علی خان نے سر پکڑ لیا۔

"اوہو بھو! ایسا کیا مسئلہ ہے؟ تم نہیں جاتیں تو شمیرا چلی جائے۔ کافی لڑکیاں ہیں بے کار گھر میں۔" آغا جی نے مداخلت کی۔

"میں کیوں جاؤں اکیلی، میرا دل تنگ ہوگا۔" شمیرا کونے میں بیٹھی منمنائی۔ علی خان نے گھور کر دیکھا۔

"کیا میں کھا جاؤں گا تمہیں؟ فل والیوم سے اسٹیریو بجاتی رہنا وہاں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔" ساتھ ساتھ لالچ دیا گیا۔

شمیرا بے چاری کو ایک ہی تو مرض ہے میری طرح۔ اور وہ ہے اسٹیریو پوری آواز سے بجانا۔ لیکن ادھر بے چاری والیوم دو کلو واٹ تک ہی لے جاتی ہے، کہ سارا گھر اس کی جان کو آجاتا ہے۔ گھر سے "ہائیسکوپ" جانے پر، اب میری طرح ڈھیٹ بھی نہیں کہ سنی ان سنی کر کے اپنی مرضی چلائے۔ خون کے گھونٹ پی کر اس دن کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ جب اس کی شادی ہو جائے گی اور وہ سارا دن پوری آواز سے میوزک بجایا کرے گی۔ (گویا شادی شدہ لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہوتا خیر سے)۔

علی خان نے جو سبز باغ دکھائے۔ تو شمیرا کی رال ہی تو ٹپک گئی۔ شادی کے گورکھ دھندے میں پھنسے بغیر بھی یہ ارمان پورا ہو سکتا ہے۔ یہ غالباً اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"مجال ہے، جو اس گھر میں فرشتے قدم رکھیں۔" بی بی کلاں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"علی خان! اس لڑکی کو زیادہ سر نہ چڑھانا۔ عادتیں بگڑتی جا رہی ہیں اس کی۔" امی نے فتویٰ صادر کیا۔

"لیکن لالہ! میرے ساتھ اور کوئی تو جائے گا نا؟" شمیرا ابھر بولی۔

"واہو۔ جتنے اسپیئر پارٹس ہیں گھر میں۔ سب چلیں۔ اتنا کما لیتا ہوں کہ سب کو اچھی طرح پال لوں۔" علی خان منہ بنا کر بولا۔

"یہ ہوئی نا بات۔ پھر تو گستہ چلے گی۔ اور سندرہ اور گل مہر اور تہمین کو بھی۔" شمیرا روانی جذبات میں بولنے لگی۔

"نہ بابا۔ اتنی لڑکیوں کے ساتھ میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔ صرف گستہ اور سندرہ چلیں۔ تہمین آئی تو اس کے اور گستہ کے درمیان چوبیس گھنٹے محاذ جنگ گرم رہے گا۔ اور میں بھی اس کے ساتھ زیادہ امن و امان سے نہیں رہ سکتا۔ جنوری کے آخر تک شہباز کا ایم ایس سی کا فائنل ایگزام ہے۔ ایک ماہ تک وہ بھی آجائے گا۔" علی خان سوچتے ہوئے بولا۔

شکر ہے اس وقت گل بیو موجود نہ تھیں موقع پر۔ ورنہ اپنی لاڈلی تہمین کے متعلق اپنے بھتیجے کے تاثرات سن کر چراغ پا نہ ہو جاتیں۔

"گستہ بھی جائے گی؟" آغا جی آہستہ سے بولے۔

"اسے جانے دو نا خان! لڑکیاں دو سے تین ہوں تو بہتر ہے گھر میں تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ کسی کام کاج کو ہاتھ لگایا ہے کبھی۔ سارا دن کتابیں ہیں یا آوارہ گردی اور یا پھر بک بک۔ نہ بڑے کا لحاظ نہ چھوٹے کا۔ وہاں آج بھائی کا گھر سنبھالے گی تو کل کو کسی اور کا گھر بھی سنبھال سکے گی۔" امی ایک بار شروع ہو جائیں تو پھر بے تکان بولتی ہیں۔ اور اصل موضوع کو بھول کر عموماً "مجھ غریب" کے لتے لینے شروع کر دیتی ہیں۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ چلی جائے۔ ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔ ایم اے کر کے گھر میں بیٹھے بھی کافی زمانہ ہو گیا بے چاری کو۔" آغا جی جلدی سے بولے تاکہ امی کی تقریر زیادہ طویل نہ ہو جائے۔

"لڑکیو! تم اپنا بوریہ بستر باندھ لو۔ میری صرف دو دن کی چھٹی اور رہتی ہے۔ پرسوں ہم روانہ ہو جائیں گے۔" علی نے ہمیں مخاطب کیا۔

دوسری شام مجھے "بوریہ بستر" کے سلسلے میں علی سے بے بھاؤ کی پڑیں۔

"کس الو کے پٹھے نے تم سے کہا تھا۔ کہ اپنا بستر بوری میں ڈال کر باندھ لو۔" اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر غصے میں پوچھا۔

"تمہی نے تو کہا تھا۔" میں معصومیت سے بولی۔ اس کا ہاتھ کمر سے ہٹ گیا۔ اور علی پاؤں پٹخنے [illegible] لگا۔

"کس قدر بے ہودہ لڑکی ہو؟" وہ بڑبڑایا۔

"علی! مائنڈ یور لینگویج!" میں نے اسے دھمکی دی۔

علی نے دانت پیس کر مجھے دیکھا اور جلدی سے باہر چلا گیا۔
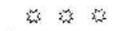
☼ ☼ ☼

دوسرے دن ہم راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ جہاں دو دفعہ سیٹ کینسل ہونے کے بعد، تیسری مرتبہ لکڑی اور لوہے کے ایک خستہ حال چھکڑے میں...... ہمیں گلگت پہنچا دیا گیا۔

سندرہ جسے خاندان بھر میں "گمنام سپاہی" کہا جاتا ہے، اس قدر کم گو اور بے ضرر واقع ہوئی ہیں کہ سب ہی ان پر ترس کھاتے ہیں۔ اور ان کے وجود اور عدم وجود پر مشکوک ہیں۔ انہوں نے اسٹیشن پر اترتے ہی لرز کر فرمایا۔

"علی لالہ! ادھر تو ظالم سردی ہے۔" الفاظ بھی ان کے منہ سے لڑکھڑاتے ہوئے برآمد ہو رہے تھے۔

"یونہی تو نہیں رو رہا تھا کہ یہاں رہنا جان جوکھوں کا کام ہے۔" علی نے قلیوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سوٹ کیس کس گدھی کا ہے؟" بے چارے علی سے میرا سوٹ کیس اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ کیونکہ دونوں قلی سندرہ اور شمیرا کے ہلکے ہلکے سوٹ کیس اٹھا کر چلتے بنے تھے۔

"گستہ کا ہے۔" شمیرا ڈرتے ہوئے بولی۔

"آخر کیا لائی ہے تو اس میں؟" علی نے جھنجلا کر مجھے گھورا۔

"اسکیٹنگ کا سامان۔" میں نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"کیا؟" علی خان نے مارے حیرت کے سوٹ کیس زمین پر دے مارا۔

"تو تم کیا تو یہاں یہ کارنامے سرانجام دے گی؟" وہ تلملا کر بولا۔

"ہاں تو کیا سارا دن گھر میں بیٹھ کر گھاس چھیلوں گی؟" میں بگڑ کر بولی۔

"گستہ! گستہ... باز آجاؤ اپنی ان حرکتوں سے۔" وہ دھمکی دینے لگا۔

"بیکار ہے علی! میں اسکیٹنگ سلو پس پر اسکیٹنگ کیے بغیر نہیں رہوں گی۔" میں فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"اور جو تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے تو کون ذمہ دار ہو گا؟" علی نے اپنے ڈرائیور کو میرا سوٹ کیس پکڑاتے ہوئے کہا۔

"تو تم کس مرض کی دوا ہو' سرجن ہو گھسیارے تو نہیں۔" میں ترخ کر بولی۔

علی خان کو مجبوراً" چپ ہو جانا پڑا۔ کیونکہ ڈرائیور نے کبھی ڈاکٹر صاحب کو عالم جلال میں نہ دیکھا تھا اور علی کو اپنی عزت بہت پیاری ہے۔

علی خان کو اچھا خاصہ بنگلہ ملا ہوا تھا جو ہاسپٹل سے بمشکل پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ صبح اٹھ کر جو وہ ہاسپٹل جاتا تو دو بجے واپس آتا اور پھر لمبی تان کر سوتا۔ شام اس کی عموماً" اپنے دوستوں کے ساتھ گزرتی۔

ایک ہفتے کے اندر ہی اس نے ہمیں ارد گرد کے سارے علاقے گھما دیئے۔

تلتو کے شاندار اسکیٹنگ سلوپس دیکھ کر روح سیراب ہو گئی۔ جہاں آرمی' ایئر فورس کے آفیسرز کو تربیت دی جاتی ہے۔ گھر میں کام کاج کے لیے تین ملازم موجود تھے۔ چنانچہ بڑے ٹھاٹ تھے۔

شمیرا سارا دن با آواز بلند اسٹیریو بجاتی تھی اور سندرہ آتش دان کے پاس بیٹھی ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے غور و فکر کیا کرتی تھی۔ بوریت انتہا کی تھی۔

میرے پیروں میں بالآخر کھجلی ہوئی' اسکیٹنگ تھوڑی بہت آغا جان سے سیکھی تھی۔ کیونکہ برف باری ہمارے ہاں بھی غضب کی ہوتی ہے۔ آغا جان اپنی ٹانگ میں چوٹ آنے سے پہلے باقاعدہ اسکیٹنگ کرتے تھے۔ اور اسکیٹنگ تو پاؤں میں اسکیٹرز پھنسائے سب ہی کرتے تھے۔

آغا جان نے ٹانگ میں تکلیف کی وجہ سے اپنے شوق کو خیرباد کہا تو ان کا سارا سامان میں سمیٹ لائی۔

☆ ☆ ☆

ایک صبح جو سارے سامان سے لیس ہو کر پہلی بار اسکیٹنگ کی نیت سے چلی تو سندرہ اور شمیرا مجھے رخصت کرنے گیٹ تک آئیں۔

"دیکھو گستہ! صحیح سلامت واپس آجانا' مرنے کی کوشش نہ کرنا۔" شمیرا نے نصیحت کی۔

"اس سے زیادہ بے ہودہ خیال آپ کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا؟" میں نے دستانے چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا تو دل بیٹھ رہا ہے شمیرا! اگر اس لڑکی نے کوئی ہڈی پسلی تڑوالی تو کیا کریں گے؟ کوئی بڑا بھی یہاں نہیں کہ اسے منع کرے۔" سندرہ پریشان ہو کر بولی۔

"نہ تو کسی بڑے کی بات مان لینی تھی میں نے؟" میں نے پیر اسکیٹرز میں پھنساتے ہوئے کہا۔

"وہاں تو منہ سے پھوٹی ہی نہیں نا' ورنہ آغا جی آنے دیتے تجھے اس خطرناک سامان سمیت۔" شمیرا جو اس وقت اپنے آپ کو میری سلامتی کا ذمہ دار سمجھ رہی تھی۔ پھٹ پڑی۔

"کچھ نہیں ہوتا مجھے' ناداں تو اور کچھ ہو گیا تو شناختی کارڈ ہے میری جیب میں۔ کوئی نہ کوئی پہنچا دے گا۔ علی کا نام پتہ بھی جیب میں رکھا ہے میں نے۔" مجھے انہیں تسلی دینا پڑی۔

"اور جو تجھے کوئی اٹھا لے گیا تو؟" سندرہ کانپنے لگی۔

"شامت بلوائی ہے کسی نے اپنی؟" میں نے منہ بنایا۔

اس کے باوجود نہ سندرہ کو اطمینان ہوا نہ شمیرا کو۔ بلکہ روانہ ہونے سے پہلے مجھ پر باقاعدہ جھاڑ پھونک کی گئی اور تلتو کی برف پوش وادی میں برف پر پھسلنا'

آزاد فضاؤں میں اڑتے ہوئے مست پرندوں کی طرح سحر انگیز تھا۔ مجھے ان اِکا دُکا حیران نگاہوں کی بھی پروانہ تھی جو مجھے عورت ہونے کے ناتے پہچان لیتی تھیں۔ برف پر پھسلتے ہوئے لوگ مجھے قریب سے دیکھتے تو ٹھٹک جاتے۔ شاید اس سے پہلے کسی خاتون نے یہاں

اسکیٹنگ جیسا خوبصورت تجربہ نہ کیا تھا۔

شروع شروع میں تو کثرت سے گرتی رہی۔ لیکن چند دن کے اندر مہارت' تجربہ اور اعتماد سب ہی کچھ مل گیا۔

علی خان نے میری ان حرکتوں پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ یوں بھی تلتو کے رہنے والوں کو اب پتہ چل گیا تھا کہ میں ان کی کزن ہوتی ہوں اور علی کے دوستوں میں اس کی خاصی عزت افزائی ہوئی تھی۔ لیکن بے چارہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ کہ میں نے پہلے کسی کی سنی ہے۔ جو اس کی سنتی۔ اور اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ میں اپنے مشغلے میں تن' من' دھن سے سنجیدہ ہوں اور ہزار چوٹیں کھا کر بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔

ایک شام چائے پیتے ہوئے میں نے اعلان کیا "میں کل سے اسکائی جمپس شروع کرنے جا رہی ہوں۔" سندرہ اور شمیرا پھر کانپنے لگیں (میرے متوقع عبرت ناک انجام کا سوچ کر)

"وہ بے ہودہ کتاب پڑھ پڑھ کر۔" علی نے اخبار کے اوپر سے جھانکتے ہوئے طنزیہ کہا۔

میں ان دنوں اسکیٹنگ پر دو چار کتابیں پڑھ رہی تھی' مجھے اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر سرجن صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔

"گستہ! میں آخر بار بتا رہا ہوں تمہیں' تمہارا کچھ ٹوٹا تو میں نہیں جوڑوں گا ہرگز۔"

میں نے کندھے اچکائے۔ "ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ ڈاکٹر گردیزی تو نہیں ہیں نا ابھی۔"

علی خان نے تاؤ کھا کر اخبار ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بڑبڑانے کا سلسلہ جاری رہا۔ "کس مصیبت کو لے آیا ہوں ساتھ؟ کل کو کچھ ہو گیا تو آغا جی کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

شمیرا اور سندرہ اسے دیکھ دیکھ کر سہمی جا رہی تھیں۔ مالا تا۔ علی کے غصے کی حقیقت ہی کیا۔

اچانک موصوف رکے' چٹکی بجائی' میری طرف لپکے' بازو پکڑ کر کرسی سے گھسیٹا اور لپکے باہر کو۔ شمیرا اور سندرہ بڑبڑا کر اٹھیں۔ "یا الہٰی کیا ہو گیا ہے؟"

خود میں گرتی پڑتی چیخ کر بولی۔ "کدھر لے جا رہے ہو مجھے؟"

سندرہ نے سر تھام لیا۔ "یہ لالہ ضرور آج اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنائے گا۔ کئی دن سے گستہ کو قتل کرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ ارے روکو شمیرا! اسے۔"

اس دوران علی مجھے اندر دھکیل کر خود بھی جیپ میں بیٹھ چکا تھا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور یہ جا وہ جا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اونچی آواز میں اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی معافی مانگنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر بعد جیپ ایک بنگلے کے احاطے میں رکی۔ "اترو نیچے۔" غراہٹ کے ساتھ حکم ملا۔

مرتا کیا نہ کرتا' علی کا حکم مانتے ہی بنی۔ اور جس بے تکلفی سے وہ اس گھر میں گھسا تھا لگتا تھا کسی دوست کا ہی ٹھکانہ ہے۔

اندر لاؤنج میں آگ جل رہی تھی اور کوئی دروازے کی طرف پشت کیے مطالعے میں مصروف تھا۔

"شبلی!" علی نے اندر گھستے ہی نعرہ لگایا۔

میں نے لاؤنج کا دروازہ بند کرتے ہوئے مطالعے میں مصروف آدمی کو پلٹتے دیکھا۔

"ارے علی! تم' اتنے خراب موسم میں؟" وہاں سے حیرت کا اظہار ہوا۔

"ارے میری یہ کزن ہے ناگستہ! مجھے مروا کر دم لے گی دادا جان سے۔ آمادہ بہ خودکشی ہے بالکل۔ کچھ علاج کرو اس کا۔" علی چھوٹتے ہی بولا۔

میں خاطر خواہ شرمندہ ہوتے ہوئے سوچنے لگی۔ شاید یہ آدمی کوئی ڈاکٹر یا سائیکاٹرسٹ ہو جو میری تحلیل نفسی کر کے مجھے اس شوق سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔

علی کے دوست نے بڑے غور سے علی کی تقریر سنی

اور پھر اطمینان سے بولا۔ "بیٹھو یار! اور آرام سے بات کرو۔ تشریف رکھیے بی بی!" وہ پہلی بار میری طرف متوجہ ہوا۔

علی کرسی پر گر کر یوں ہانپنے لگا جیسے بڑا پہاڑ کھود کر آیا ہو۔ میں بھی چپکے سے آگ کے پاس بیٹھ گئی۔ خدا خدا کر کے علی کو تعارف کا خیال آیا۔ "یار یہ میری کزن ہے گستہ ارباب۔ اور گستہ! یہ میرا دوست ہے شبلی۔ شبلی نعمانی۔" وہ شبلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اوہ۔" میں اچھل پڑی۔ ان دونوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

"تو آپ ہیں شبلی نعمانی۔ مجھے پتہ نہیں تھا۔ اتنا بڑا رائٹر علی کا دوست ہے۔ آغا جی آپ کی 'سیرۃ النبی' بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔"

شبلی ہنسنے لگا۔ علی نے مجھے زیر لب "الو کی پٹھی" کہا پھر زور سے بولا۔ "یہ وہ شبلی نعمانی نہیں ہے احمق۔ یہ تو ایئر فورس کا آفیسر ہے اور پی ایف والوں کا اسکیٹنگ انسٹرکٹر۔" میں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

"سوری شبلی صاحب!"

"تم بہت دلچسپ ہو۔" وہ مجھ سے بولا۔

"جی ہاں' بہت ہی دلچسپ۔" علی دانت پیس کر بولا۔ اور پھر میری پوری رام کہانی اسے کہہ سنائی۔

"یا تو تم اسے منع کرو شبلی اور یا پھر صحیح کوچنگ کرو۔ تاکہ میرا سر بھی سلامت رہے۔" وہ آخر میں بولا۔ اور شبلی بھلا میرا کوچ بننا کیوں نہ قبول کرتا۔ زندگی میں پہلی بار تو کسی لڑکی کا استاد بننے کا شرف ملا تھا۔

ہماری شام اسکیٹنگ کے بارے میں گفتگو کرتے ہی گزر گئی جبکہ علی خان چین سے بیٹھا سیروں کے حساب سے خشک میوہ کھاتا رہا۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن سے شبلی کی زیرِ نگرانی میری تربیت شروع ہوئی۔ صبح تو وہ اپنی ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ دوپہر کے بعد میری کوچنگ کرتا اور ہم شام تک اسکیٹنگ کرتے رہتے۔

سندرہ اور شمیرا پر تو علی کا کارنامہ سنتے ہی سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"سبحان اللہ' یہ علی کو ہو کیا گیا ہے؟ آغا جی نے سنا تو سیدھا کر دیں گے صاحبزادے کو۔ اور اس محترمہ کو دیکھا کس ٹھاٹ سے غیر مرد کے ساتھ آوارہ گردی کرتی پھرتی ہیں۔" بستر میں گھسی دونوں لڑکیاں رات گئے تک بڑبڑاتی رہیں۔ اور میں سنی ان سنی کیے۔ ہیڈ فون لگائے بی بی سی سنتی رہتی۔

ایک ہفتے بعد شہباز بھی آپہنچا۔ اس کا امتحان کے بعد رزلٹ بھی آچکا تھا اور اس نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ مبارکبادیاں وصول کرنے کے بعد جو اسے میرے تازہ مشغلے کا علم ہوا تو اس کی بھی رگِ اربابیت پھڑکی۔

"علی! تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا؟ یہ لڑکی سارا وقت اس آدمی کے ساتھ تنہا پھرتی رہتی ہے۔"

وہ بری طرح بڑے بھائی پر برس پڑا۔

"ہاں تو میں کیا کرتا؟ یہ لڑکی مانتی تھی میری بات؟ اب تو وہ اسے صحیح تربیت دے رہا ہے۔ اور وہ بہت شریف آدمی ہے میں اس کی رگ رگ کو پہچانتا ہوں۔" علی بڑے وثوق سے بولا۔

"رگ رگ تو تم بے شک اس کی پہچانتے ہو گے۔ لیکن اگر گاؤں میں اور خاندان والوں کو اس بات کا علم ہو گیا تو کتنی باتیں بنیں گی؟ کچھ پتہ ہے تمہیں؟" شہباز خالصتاً "زنانہ دوراندیشی" سے بولا۔

"ہاں تو تم ہی بتاؤ کیا کرتا میں؟" علی بے چارگی سے بولا۔ "ٹانگیں توڑ کر کسی کوٹھری میں ڈال دیتے۔ واپس بھجوا دیتے اور کیا کرتے؟" شہباز مزید گرجا۔

"اے۔ اے صاحبزادے! ذرا ہوش میں آؤ میری ٹانگیں توڑنا ایسا بھی بچوں کا کھیل نہیں میاں!" میرا یہ کہنا تھا کہ گویا جلتی پر تیل پڑ گیا۔ پھر تو ہم دونوں کے درمیان وہ گھمسان کا رن پڑا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

سندرہ اور شمیرا ایک کونے میں دبکی آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر کبھی اس کی طرف اور کبھی میری طرف پھونکتی رہیں۔

علی بیچ میں بولتے اور مصالحت کرانے کی ناکام کوششیں کرتا رہا۔ لیکن نقار خانے میں اس کی سنتا کون؟

میں اور شہباز حلق کے بل چیختے رہے اور جب چیختے چیختے تھک گئے تو خود ہی چپ ہو گئے۔ اب علی کو بولنے کا موقع ملا اور اس نے فوراً فیصلہ صادر کر دیا کہ یا تو میں یہاں رہوں گی یا شہباز' اور چونکہ مجھے یہاں آئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اس لیے اب شہباز یہاں رہے گا اور مجھے واپس جانا ہو گا۔

"ٹھیک ہے میں کون سا مری ہوں یہاں رہنے کے لیے۔ چلی جاؤں گی کل ہی۔" میں بھنا کر بولی اور کمرے سے نکل آئی۔

مجھے سندرہ اور شمیرا کی نظروں سے بھی بوریت ہو رہی تھی۔ جنہیں پورا پورا یقین تھا کہ شبلی مجھے دیکھتے ہی شہید ہو چکا ہے۔ جیسے اس نے دنیا میں اور کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی اور یہ کہ ہم اسکیٹنگ کے بجائے اکٹھے دوگانے گاتے پھرتے ہیں۔ سوچا' کافی ہو چکی اسکیٹنگ' اب چلنا ہی چاہیے واپس۔ لڑکیوں نے شہباز کو آمادہ کر لیا کہ میرے جانے کے بعد وہ ان کے کمرے میں سویا کرے کیونکہ دونوں کو اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔

لیکن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ صبح ہوتے ہی پشاور سے علی اور شہباز کے خالہ زاد احمد کی کال آگئی۔

شہباز کے ڈپارٹمنٹ کا کوئی لیکچرر ایم' ایس کرنے اس ہفتے امریکہ جا رہا تھا۔ اور شہباز کو فوراً "ان کی جگہ پڑھانے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔

اور شہباز بھلا ایسا سنہری موقع ہاتھ سے جانے دیتا۔ احمد سے بات ختم کرتے ہی اس نے جیپ منگوانے کا حکم صادر کر کے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔

ادھر شمیرا اور سندرہ نے واویلا مچا دیا۔ "شہباز بھی جا رہا ہے۔ گستہ بھی چلی جائے گی۔ علی لالہ! ہم دونوں تو

ایک ہی رات میں گزر جائیں گے ڈر کے مارے۔ ہم بھی چلے۔"
اب علی سے برداشت ہو نہ سکا۔ اس مرد دلیر نے ناشتہ کرتے کرتے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
"ہائیں' ہائیں" ہم سب کے منہ کھل گئے۔
"ارے علی! کیا ہوا بھئی؟" شہباز بھی گھبراہٹ میں لپکا۔
"میں پوچھتا ہوں' آخر کب تک تم لوگ میرے صبر و ضبط کا امتحان لیتے رہو گے؟" اس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے میز پر گھونسا مارا اور چائے کی پوری پیالی اس کی گود میں الٹ گئی۔
"ہر وقت تم لوگ کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا رکھتے ہو۔ میں تم سب کو لایا کس لیے تھا؟ جواب سب اکٹھے ہی واپس روانہ ہو رہے ہو۔" وہ میز سے اٹھتے ہوئے بلبلایا۔
شمیر اور سندرہ نے شرمندہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکا کر بولیں۔ "تو پھر گستہ کو روک لیں لالہ جی۔"
"گستہ کہیں نہیں جا رہی' یہیں رہے گی۔" علی غسل خانے کی طرف لپکتے ہوئے فیصلہ دے گیا۔
شہباز نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "خوب خاندان کا نام روشن کرے گی۔"
جی تو چاہا کھینچ ماروں چائے دانی سر میں۔ پر ابھی خود چائے نہیں پی تھی۔ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اور وہ اسی دن واپس چلا گیا۔
میری قابل اعتراض سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں۔ علی کو مریضوں میں دم عیسیٰ ڈالنے سے فرصت نہ تھی۔ سندرہ اپنے جینز کے پلنگ پوش کاڑھنے میں مصروف رہتی شمیر' جدید موسیقی پر ریسرچ کر رہی تھی۔ پھر میں بھلا اور کیا کرتی؟
شبلی بھی کوچنگ کی حد تک ٹھیک تھا۔ اس سے آگے معاہور۔ اچھے سے اچھا شعر پڑھو۔ اعلا سے اعلا اقتباس سناؤ۔ مجال ہے جو موصوف کے کان پر جوں تک رینگ جائے۔
ایک دن میرا ان سے شدید قسم کا جھگڑا ہو گیا۔
حسب معمول غالب کا ایک بہت اعلا شعر پڑھا تھا' ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بے پروائی سے کان جھٹکتے رہے۔ اس کے بعد میں نے ایک نہایت پھیپھڑ شعر پڑھا۔ سننا تھا کہ جناب پھڑک اٹھے۔ تڑپے اور دوبارہ سنانے کی استدعا کی شعر تھا۔

اگر تانگے میں آنا تھا' تو پیچھے بیٹھ جانا تھا
ترے پہلو میں بیٹھا کوچوان اچھا نہیں لگتا!

جو نجانے کدھر سے نازل ہو گیا تھا۔
شبلی کا مچلنا تھا کہ مجھے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔
"مولانا! اب میرا اور آپ کا گزارا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آپ اپنا راستہ ناپیے۔ میں اپنا لیتی ہوں۔" میں بھڑک کر بولی۔
مولانا کے خطاب کو یوں برا نہیں مانتے تھے کہ میں انہیں صدق دل سے سیرۃ النبیؐ والا شبلی نعمانی سمجھتی تھی اور اب زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی ان کی معصومیت اور بے خبری کی ادا۔
"میں آپ کو کافی شریف آدمی سمجھتی تھی۔ لیکن یہ میرا بے ہودہ خیال تھا۔ جسے میں واپس لیتی ہوں۔ آپ جو اتنے گھٹیا شعر کو سراہ سکتے ہیں۔ ہرگز ہرگز ایک عظیم کتاب کے مصنف نہیں ہو سکتے۔"
اس تقریر کے جواب میں نہایت اطمینان سے کہا گیا۔
"مجھے اس کا دعوا کب تھا گستہ ارباب؟ یہ تو آپ کے ہی بخشے ہوئے اعزازات ہیں۔" یعنی مزید جلتی پر تیل چھڑکا جا رہا تھا۔
"بہرحال اب میں سارے اعزازات واپس لیتی ہوں۔ خدا حافظ۔" میں پلٹ کر چل دی اور انہوں نے دوسری طرف منہ کر کے بیک اسٹریٹ بوائز کا ایوری باڈی گنگنانا شروع کر دیا۔
میں پاؤں پٹختی گھر میں گھسی ہی تھی کہ سندرہ نے چہک کر اطلاع دی۔ "آگیا ہے تمہارا وارنٹ

گرفتاری۔"
میں نے دروازہ زور سے مارا اور پیچھے آتا علی اپنی ناک اور عینک تڑوانے سے بال بال بچا۔ "واٹ دی ہیل ڈو یو مین گستہ؟" وہ حلق کے بل دھاڑا۔
"میں کل واپس جا رہی ہوں۔" میں نے جوتے اتارتے ہوئے خشک لہجے میں اعلان کیا۔
"کیا مطلب؟" علی خان اپنا پچھلا غصہ بھول گیا۔
"مطلب یہ کہ کیا فائدہ ہوا مجھے یہاں آنے کا؟ دماغ خشک ہو گیا ہے جاہلوں کے ساتھ ساتھ رہ رہ کر۔"
"گستہ! تم نے مجھے جاہل کس طرح کہا۔۔۔؟" علی خان بری طرح تملایا۔
"تمہیں کون الو کا پٹھا کہہ رہا ہے؟ یہاں کی ساری آب و ہوا ہی ایسی ہے اور میں کل واپس جا رہی ہوں۔" میں نے جوتے اٹھا کر اپنی کمرے میں گھستے ہوئے حتمی اعلان کیا۔ علی خان نے غصے میں مکہ لہرایا اور گیلری میں رکھے ہوئے وینس کے مجسمے کو شہید کر ڈالا۔ جس کے سلسلے میں مجھ غریب کو ہی صلواتیں پڑیں۔
اگلی صبح علی کے قہر اور شمیر' سندرہ کی فریادوں سے بے نیاز میں علی کے ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی آئی۔
چار دن بعد گھر پہنچنے پر مجھے "ریڈ کارپٹ ویلکم" دیا گیا کہ کسی شاہی مہمان کو بھی کیا ملا ہو گا۔ پتہ چلا جو وارنٹ گرفتاری میرے لیے آیا تھا۔ وہ آغا جی کا تھا جو میرے لیے بے حد اداس تھے۔
آغا بی بی نے پہلے تو میری بہت بلائیں لیں۔ لیکن جونہی انہیں پتہ چلا کہ میں ان کے معصوم بچوں کو ان کی مرضی کے خلاف چھوڑ کر آئی ہوں۔ فوراً" لتے لینے شروع کر دیے۔
شام کی چائے پر مجھے اپنا سفرنامہ سنانے کو کہا گیا اور اس سفرنامے کا سب سے عبرت ناک' دہشت ناک اور خواتین کے نزدیک خصوصیت سے شرمناک حصہ وہ قرار پایا جب ذکر چلا میری اسکیٹنگ کا۔
آغا جی خاموش ہو گئے۔ عورتوں نے شرم اور صدمے سے سر نیہوڑا لیے (ایک غیر مرد کے ذکر پر) ہاں صرف اور صرف جان آغا کے منہ سے وقتاً" فوقتاً" صدائے تحسین و توصیفی کلمات بلند ہوتے رہے۔ کیونکہ انہیں میری حرکتوں میں اپنا بیتا شباب جھلکتا دکھائی دے رہا تھا۔
سفرنامہ ختم ہوا۔ آغا جی اور دیگر مرد حضرات اٹھ کر حجرے میں چلے گئے۔ کیونکہ ان کا یہ وقت ہمیشہ وہیں گزرتا تھا اور میری تو آ گئی شامت۔ جس کی جتنی توفیق ہوئی اس نے اتنا ہی آڑے ہاتھوں لیا۔
"ذرا صاحبزادی کے سر پر کوئی بڑا نہ ہو۔ فوراً" بے مہار ہو جاتی ہیں۔" اوجی بھڑک کر بولیں۔
"کیوں نہیں تھا بڑا؟ علی مجھ سے بڑا نہیں ہے کیا؟" میں تلملائی۔
"تب ہی تو میں کہوں میرا شہباز ہرگز غلط نہیں لکھ سکتا۔ اس نے تو اپنے خطوں میں دو تین بار لکھا تھا۔ گستہ کو واپس بلا لو۔ وہ وہاں پورے خاندان کا نام روشن کر رہی ہے۔" آغا بی بی نے انکشاف کیا۔
"اور نہیں تو کیا؟ کسی اور خاتون نے پہلے اسکیٹنگ کی ہے ہمارے خاندان میں۔" میں خوش ہو کر بولی۔
"اللہ محفوظ ہی رکھے ایسی بے شرمی کی حرکتوں سے۔" بی بی کلاں تڑخ کر بولیں۔
"بات دراصل یہ ہے کہ اس خاندان کے مردوں کی غیرت سو گئی ہے۔ ورنہ اس لڑکی کی یہ مجال ہوتی کہ غیر مردوں کے ساتھ کدکڑے لگاتی پھرے۔ دیکھ نہیں رہے تھے باپ دادا کو' کیسے چپ بیٹھے تھے اور اولاد تھی کہ مزے سے داستانیں سنا رہی تھی۔ انہوں نے ہی سر چڑھایا ہے اس ناخلف کو۔" امی نے بھرپور تقریر جھاڑی تھی۔
میں بے زار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ان عورتوں کو تو میرے ہر کام میں کیڑے نظر آتے ہیں اور کسی کے پیچھے بولیں نہ بولیں' میرے پیچھے ضرور باتیں بنائیں گی۔ سو کرنے دو۔ ایک ہی تو مشغلہ ہے بے چاریوں کا۔"

☼ ☼ ☼

اس دن آغا جی کے ساتھ چہل قدمی سے لوٹتے ہی سلامتی نے ڈاک لا کر دی۔

گل کا 55 صفحوں کا خط صرف میرے متعلق ہی انکشافات سے بھرپور تھا۔ کیونکہ میں پشاور سے ہو کر آتے جاتے اس کے گھر نہ جا سکی تھی۔ اور شہباز سے صدر میں دونوں میاں بیوی کی ملاقات ہوئی تو اس نے گل کو میرے خلاف خوب بھڑکایا تھا۔

جاوید کا بھی خط تھا جس میں اس نے حسب معمول اپنی ذات پر میرے بے پناہ احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ایم ایس سی کا دوسرا سمیسٹر کامیابی سے ختم ہونے کی اطلاع دی تھی اور کچھ آمنہ کا ذکر بھی کیا تھا۔

پر تیسرے خط کی تحریر بڑی انجان سی تھی۔ کھولا تو نیلے رنگ کا کاغذ کنگوزمین کی ہلکی سی مہک کے ساتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔ نہ خطاب نہ سلام صرف اتنا لکھا تھا۔

"ناراض ہو کر گئی ہو؟ جاتے جاتے اتنا بھی نہیں جتایا کہ تم جا رہی ہو۔ شکوہ اس لیے کر رہا ہوں کہ بہت قریب سے ہو کر گئی ہو اور بے حد اجنبی بن کر۔"

لکھنے والے نے اپنا نام پتہ کچھ نہیں لکھا تھا اور کتنے پیار سے لکھا تھا اس نے۔

دل میں ایک عجیب کیفیت سر اٹھا رہی تھی اور حلق میں آنسو گرنے لگے تھے۔

"تو کیا میں اس شخص کو غلط سمجھی تھی؟"

یہ خط لکھنے والا تو بڑے گہرے اور سچے جذبات کا مالک تھا، اپنی تمام تر سادگی اور Practicality کے باوجود۔

میں اسے معذرت نامہ لکھتی بھی تو کیسے؟ کوئی ایڈریس نہیں تھا۔ چپ چاپ کھڑکی سے باہر عالی اور ناہید کو ٹینس کھیلتے دیکھتی رہی۔

ایک ہفتے بعد مجھے اس کا دوسرا خط ملا۔ صرف اتنا لکھا تھا۔

"تم بہت یاد آتی ہو۔ تلتراب سے پہلے اتنا اداس، اتنا ویران کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس طرح سے جانا تھا۔ تو آئی کیوں تھیں؟"

اف...... دل تھا کہ طوفانوں کی زد میں۔

عالی شان کے دیے ہوئے دکھ کو میں نے کب کا لوریاں دے کر سلا دیا تھا۔ یہ کون دوسرا تھا؟ جو یوں دبے پاؤں، یوں انجانے میں اسی مقام پر دوبارہ پہنچ گیا تھا۔

یہ کس نے ذہن کو کئی سال پہلے کی طرح کھرچنا اور اذیتیں دینا شروع کر دی تھیں۔

کستہ ارباب جانے کیسی طوفانی اور متلاطم زندگی لے کر آئی تھی دنیا میں۔

میں اسے کیسے سمجھاتی؟ خود مجھے بھی معلوم نہ تھا۔

دن گزر رہے تھے۔ ان دنوں گھر میں میری اور حنی کے رشتے کی بات زوروں پر تھی۔

رہا حنی، جس سے میری کبھی نہ بنتی تھی اور جو کزنز کی آپس میں شادی کا بہت بڑا مخالف تھا بیالوجکل وجوہات کی بنا پر اس نے آغا جی سے مجھے مانگا تھا اور عالی شان کے بعد خاندان بھر کا وہ دوسرا لڑکا تھا جس نے یوں دوبدو بیٹھ کر آغا جی سے بات کی تھی۔

عالی کیوں بجھا بجھا رہنے لگا تھا؟ یہ بات صرف مجھے اور آغا جی کو معلوم تھی۔ جب ہی انہوں نے حنی کو ایم ڈی کے لیے دوبارہ امریکہ جانے پر آمادہ کر لیا اور اس بات کا فیصلہ بھی حنی کے جانے تک ملتوی رکھا۔

وہ مجھے خود سے جدا کرنے کے لیے کن امتحانوں سے گزر رہے تھے۔ اس کا مجھے اندازہ تھا۔ اتنے سال انہوں نے میری شادی اچھے اچھے رشتوں کے باوجود ملتوی کیے رکھی تھی۔ خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ ان میں مجھے دور بھیجنے کا یارا نہیں۔ لیکن اب وہ مزید خود غرض نہیں بننا چاہتے تھے۔

اور پھر اب جس نے مجھے مانگا تھا وہ بھی ان ہی کی اولاد، ان ہی کا پوتا تھا اور یوں شادی کے بعد بھی مجھے اسی خاندان سے اس گھر سے وابستہ رہنا تھا۔ یہ تو کسی نے پوچھا ہی نہیں کہ میں حنی کو قبول کروں گی یا

نہیں۔ شاید یہ بات فرض کرلی گئی کہ میں انکار نہیں کروں گی۔

جاوید بھی مجھے اپنی بھابی بنانے کے لیے سرتوڑ کوششیں کررہا تھا اور ہزار باتوں کی ایک بات بچپن کی بات بھی تو تھی درست کہ ابیٔ کا میری پیدائش پر مجھے حنی کی دلہن بنانے کا اعلان آج تک نہ میرے لیے اہم تھا نہ حنی کے لیے۔

یہ کوئی حتمی بات نہ تھی۔ بلکہ جس طرح عالی شان اور زرینہ آپا گل مہر اور جاوید کی مانگ تھی۔ اسی طرح کا قصہ تھا۔ اور یہ وہ رشتے جو ٹوٹے تھے تو میری اور حنی کی بات بھی بھولی حکایت بن گئی تھی۔ جسے اگر حنی خود ہی نہ چھیڑ دیتا تو سب ہی فراموش کرچکے تھے۔

ان ہی دنوں شبلی کا تیسرا خط آیا۔

"میں اور عذاب برداشت نہیں کرسکتا۔ تمہیں حاصل کرنے کے لیے اپنے ماں باپ کو بھیج رہا ہوں۔ جیسا بھی ہوں' جانتی ہو لیکن معمولی باتوں کی آڑ لے کر انکار نہیں کروگی نا؟"

کاش اسے پتا ہوتا وہ کس طرح کند چھری سے آہستہ آہستہ مجھے ذبح کیے دے رہا تھا۔

علی خان نے آغاجی کو شاید پہلے سے فرحت نعمانی صاحب کی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

دونوں میاں بیوی دو دن ہمارے ہی گھر ٹھہرے۔ ان کے جانے کے بعد ناہید نے مجھے بتایا کہ وہ شبلی کے لیے میرا رشتہ مانگنے آئے تھے۔

گھر بھر میں عجیب سی فضا تھی۔ سب ہی چپ چپ رہنے لگے تھے۔

ایک شام آغاجی نے مجھے اپنے اسٹڈی روم میں بلایا اور علی خان کا خط پکڑا دیا۔

مجھ کو ابھی اس بات کا علم نہ تھا کہ حنی نے میرا رشتہ مانگا ہے۔ اس نے آغاجی کے نام اپنے خط میں شبلی کی بھرپور سفارش کی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ گستہ اگر کسی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے تو وہ شبلی ہے۔ یعنی علی نے بھی زندگی میں ایک اندازہ تو سو فیصد درست

لگایا تھا اور مزید یہ کہ اگر اسے شبلی پر اعتماد نہ ہوتا تو وہ مجھے اس کی ہوا بھی نہ لگنے دیتا۔

میں نے خط آغاجی کو واپس کردیا۔

"بیٹا! زندگی میں آنے والا یہ پہلا مسئلہ ہے۔ جس کا فیصلہ میں نہیں کرسکتا۔ اور یہ اس گھرانے کا پہلا رشتہ ہے۔ جسے تم خود طے کروگی۔" آغاجی دھیمی آواز میں بولے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میں انجانے میں بے شمار غلطیاں کرگیا ہوں گستہ! جن کی وجہ سے بہت سے لوگ اب تک ناخوش ہیں۔ اب کے ایسی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔ تمہاری شادی تمہاری مرضی سے ہوگی۔" انہوں نے کرسی کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور فرنچ ونڈوز سے باہر سامنے کھڑے برف پوش پہاڑوں کی تمکنت والی چوٹیوں کو دیکھنے لگے۔

میں اٹھ کر اسٹڈی روم سے باہر نکل آئی۔

آغاجی ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال کر جیسے سبکدوش ہوگئے اور میں نے ابیٔ اور بی بی گل کو کئی بار چپکے چپکے روتے دیکھا تھا۔

اوجی مجھے بات بے بات ڈانٹا کرتیں جیسے مجھ سے سخت ناخوش ہوں اور میں ان سب باتوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ میں جو اتنی کائیاں مشہور تھی کہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی تھی۔ بھلا اپنے گھر کے ماحول کی گرانی محسوس نہ کرتی۔

ابیٔ کو یہی صدمہ تھا اور باقی سب کو بھی یہ ہی خوف کہ جیسے عالی اور جاوید کے بارے میں ان کے خواب پورے نہ ہوئے تھے۔ ویسے مجھ سی گستاخ' منہ پھٹ اور خود سر کون سا ان کی امیدوں پر پوری اترے گی۔

سب کو شبلی سے دشمنی ہوگئی تھی۔ ہزاروں بار ابیٔ اور اوجی نے میرے سامنے اس دن کو کوسا تھا۔ جب میں علی خان کے ساتھ گلگت گئی تھی۔

اور علی خان کو بھی اس ضمن میں کوئی کم صلواتیں نہ پڑی تھیں۔ بلکہ آغابی بی تو اب انتقاماً اس کے لیے کسی انتہائی خوف ناک دلہن کی تلاش میں تھیں۔ مجھ

سے میں براہ راست بات کرنے کی ہمت نہ تھی۔

آغاجی نے مجھے اس قدر سر چڑھا لیا تھا کہ ماں باپ بھی منہ زور گھوڑی کے منہ میں لگام ڈالتے کتراتے تھے۔ سوچتے سوچتے دماغ شل ہونے لگتا۔

ایک طرف حنی تھا۔ اپنا کزن جس کا مزاج خداؤں کا لیکن دل سونے کا تھا اور جسے پورے گھر' پورے خاندان کی اتفاق رائے حاصل تھی۔

دوسری طرف شبلی تھا۔ ایک غیر اور اجنبی جس نے چپکے سے دل میں اپنی جگہ یوں بنائی تھی کہ عالی شان کے لیے ٹین ایج (Teen age) کی جذباتیت بھی ماند پڑنے لگی تھی۔

لیکن مجھے علم تھا کہ شبلی کے انتخاب کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مجھے عالی شان کی طرح کبھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ شبلی کو میرے گھر میں کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ وہ آج کی طرح ہمیشہ اجنبی رہے گا۔

اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرے بعد کوئی ایسی لڑکی بھی پیدا نہ ہوگی جسے بی بی گل اپنے بیٹے حنی کی دلہن بنا سکیں۔ فرار کے تمام راستے مسدود ہوگئے تھے۔

سکون قلب کہیں دور بچپن کی وادیوں میں کھو گیا تھا۔ شبلی کے لیے ہر دروازے میں قفل ڈالنے تھے۔ اسے خود تک نہیں پہنچنے دینا تھا۔

دل کے اندر جو محل کھنڈر بن بن کر ڈھے رہا تھا۔ اس کی تاریک' ویران راہداریوں میں ایک روح چیختی' سسکیاں بھرتی سرگرداں و آوارہ تھی۔

خوابوں کے سنہرے ایوانوں کے پار سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ جسے آنے والے چاند کی نقرئی کرنیں بھی کبھی منور نہ کرسکیں گی۔

اور ان ایوانوں کے سنسان در میں بیٹھی ہوئی اجاڑ چاہت اور یادوں کے جنگل میں گم راستوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہی تھی۔

حنی کی روانگی میں ایک ماہ باقی تھا۔ جب آغاجی کو میں نے اس بات کی اطلاع دی میں نے چپکے سے حنی کے لیے ہاں کردی۔

چہرے پر ان انجان خنجروں سے ملنے والا درد نظر نہ آنے دیا۔ جو ہاں کہتے ہی دل میں پیوست ہوگئے تھے۔

تھوڑی دیر میں سب کو میرے فیصلے کی اطلاع مل گئی۔ ابیٔ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

سب ہی میری طرف بھاگے چلے آئے۔

بی بی گل نے شاید بڑے ہی صدق سے منتیں' مرادیں مانی تھیں۔

میری ماں نے زندگی میں پہلی بار یوں بے تابی سے مجھے گلے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

میں نے سر اٹھا کر اوجی کی طرف دیکھا اور پھر آنسو میرے چہرے پر بھی بہنے لگے۔

بی بی کلاں' آغابی بی' نادے بی بی' میری پھوپھیاں' گل بیو اور جان بی بی مجھ پر واری صدقے ہو رہی تھیں۔

میرے دل کے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔

"واہ گستہ ارباب! اتنی محبتیں۔۔۔ اور ایسی ناکامیاں۔۔۔ ایسا پیار اور ایسی تشنگی۔۔۔ کیسے بھاگ ہیں تیرے؟ اتنا التفات اور دل پہ ایسے زخم۔"

میری شادی کو اب اتنے سال گزر چکے ہیں۔

شبلی جانے کہاں ہے؟

علی نے ایک بار بتایا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی اور میں اپنے کزن کو یہ بتانے سے قاصر رہی۔

"اے سرجن بھائی! تم اور میرا ہارٹ اسپیشلسٹ شوہر اگر کبھی میرے دل کے اندر جھانک کر دیکھ پائے تو حیران رہ جاؤ گے کہ ایک ایسے داغ دار دل کے ساتھ' اتنے سالوں سے گستہ ارباب زندہ کیسے ہے؟"